© rasailojaraid.com

مولانا محمد حنیف ندوی

ایک آیت

وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهٖمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۖ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۖ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ۖ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۚ وَاعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ (البقرہ : ۲۶۰)

اور جب ابراہیمؑ نے (خدا سے) کہا کہ اے پروردگار مجھے دکھا کہ تو مُردوں کو کیونکر زندہ کرے گا۔ خدا نے فرمایا کیا تم نے (اس بات کو) باور نہیں کیا؟ انھوں نے کہا کیوں نہیں لیکن میں دیکھنا اس لیے چاہتا ہوں کہ میرا دل اطمینان کامل حاصل کر لے۔ خدا نے فرمایا کہ چار جانور پکڑ کر اپنے پاس منگوا لو (اور ٹکڑے ٹکڑے کرا دو) پھر ان کا ایک ایک ٹکڑا ہر ایک پہاڑ پر رکھوا دو، پھر ان کو بلاؤ تو وہ تمھارے پاس دوڑتے چلے آئیں گے۔ اور جان رکھو کہ خدا غالب اور صاحب حکمت ہے۔

اس سے پہلے کی آیات میں حضرت ابراہیم کے قصے میں استدلال کے اس انوکھے اسلوب پر روشنی ڈالی گئی تھی کہ کبھی کبھی خصم کی پیش کردہ دلیل پر مناظرہ کیے بغیر، یہ زیادہ بہتر ہوتا ہے کہ از سرِ نو ایسی دلیل پیش کر دی جاتے جو زیر بحث مسئلہ میں فیصلہ کن ثابت ہو۔ اسی بنا پر جب نمرود نے احیاء و اماتت کی دلیل کو غلط معنی پہنائے تو حضرت ابراہیمؑ نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا، حالانکہ مناظرہ کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں حضرت ابراہیمؑ کو اس بات کا حق حاصل تھا کہ وہ استدلال کی نوعیت کا کھوکھلا پن واضح کرتے اور نمرود اور اس کے پیروکاروں کو بتاتے کہ احیاء و اماتت کی دلیل کو سمجھنے میں اس نے کیا ٹھوکر کھائی ہے۔ ان کی پیش کردہ دلیل کا کیونکر غلط استعمال کیا ہے اور یہ کہ بحث و حجت کے اعتبار سے اس نوع کے مغالطہ کو کیا کہتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ نے اس اندازِ بحث کے مقابلہ میں ایک دوسری روش اختیار کی جو نتائج کے اعتبار سے قطعی کامیاب رہی۔ جو یہ تھی کہ بحث و مناظرہ میں اگر حریف عمداً دھوکہ دیتا ہے اور خود فریب خوردگی میں مبتلا رہنا چاہتا ہے تو اس صورت میں اس کے پندار و دعویٰ کو مجروح کیے بغیر دلیل کا ایسا انداز اختیار کرنا چاہیے جو زیادہ آسان، زیادہ قابلِ پذیرائی اور نسبتاً زیادہ مفید ہو۔ اور اس بات کی قطعی پروا نہ کی جائے کہ مخالف کیا کہے گا یا کس حد تک اس روش کو شکست اور فرار پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محمول کرے گا۔ اس سارے قصہ میں دراصل اس حقیقت کو واضح کرنا مقصود ہے کہ بحث و مناظرہ میں انبیا علیہم السلام اور عام مناظرین میں فرق و امتیاز کی کیا نوعیت کارفرما ہے۔ انبیا علیہم السلام عام مناظرین کے برعکس کیونکر انسانی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ اور کس طرح ذہن و فکر کے بجائے قلب و ضمیر کی تبدیلی کو ہدف و مقصود ٹھہراتے ہیں۔

ان آیات میں بحث و استدلال کے ایک اور اسلوب کی وضاحت کرنا مطلوب ہے جو یہ ہے کہ جب کسی شخص کے دل میں اشتباہ ابھرے اور تسلیم و رضا کے باوجود عقلی سطح پر اطمینان خاطر مطلوب ہو یا کسی عقیدہ و ایمان کے بارے میں مزید تابش وضو، مزید علم و ادراک اور مزید تائید درکار ہو تو اس صورت میں بسا اوقات حکمت الٰہیہ کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس غرض کے لیے ایسے حالات پیدا کیے جائیں اور اس طرح واردات کی سطح پر حقیقت کو بروئے کار لایا جائے کہ شکوک و شبہات کے دل بادل آپ سے آپ چھٹ جائیں اور حق نکھر کر فکر و نظر کے سامنے آموجود ہو۔

اس اجمال کی تفسیر یوں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں یہ خلش پیدا ہوئی کہ انسان مرنے کے بعد کیونکر زندہ ہو گا۔ حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ پر مخلصانہ ایمان رکھتے تھے، توحید کے پرجوش علم بردار تھے اور پیغمبر کی حیثیت سے اس حقیقت کے زوردار مبلغ و داعی تھے کہ زندگی کا یہ ڈرامہ صرف موت ہی تک وسعت پذیر نہیں ہے بلکہ موت کے آگے بھی اس ڈرامہ کی تکمیل کا اہتمام کیا گیا ہے۔ یعنی ہر انسان کو موت کے دروازے سے ایک دوسری زندگی کے ابواب میں داخل ہونا ہے جہاں ہر انسان سے اس کے اعمال و عقیدہ کے بارے میں بازپرس کی جائے گی اور اس کے عمل و عقیدہ کے مطابق اسے سزا یا جزا اور صلہ سے دوچار ہونا ہے۔ یہ خلش شک و ارتیاب کی نوعیت کی نہیں تھی کیونکہ انبیا علیہم السلام یقین و ایمان کے اس فراز پہ متمکن ہوتے ہیں جہاں شک و ریب کی وسوسہ اندازیوں کا مطلق دخل نہیں ہوتا۔ اس خلش کا اظہار مزید اطمینان حاصل کرنے اور مزید یقین و استفادہ سے بہرہ ور ہونے کی غرض سے حضرت ابراہیم نے حضرتِ حق کے روبرو پیش کی۔ جس کی تائید خود آیت کے مندرجات سے ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کھٹک کے مداوے کے طور پہ حضرت ابراہیم کے لیے تجربہ و مشاہدہ کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موقع فراہم فرمایا۔ حکم دیا گیا کہ چار پرندے لو اور انھیں ذبح کر ڈالو۔ پھر ان کے گوشت کے ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے آس پاس کے مختلف پہاڑوں پہ پھیلا دو اور پھر ان کو بلاؤ۔ یہ پرندے تمھاری طرف دوڑتے ہوئے چلے آئیں گے۔

قرآن حکیم نے یہ نہیں بتایا کہ اس واقعہ نے تحقق کا پیراہن اختیار کیا یا نہیں۔ اور اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ قرآن حکیم کے اسلوبِ بیان میں اس طرح کی مثالیں ملتی ہیں کہ بعض اوقات نتائج کو وہ اس امید پر حذف کر دیتا ہے کہ قاری خود بخود سمجھ لے گا کہ یہ نتائج فی الواقع رونما ہوتے۔ اس لیے ہمیں اس پر ایمان رکھنا چاہیے کہ اس تدبیر نے عمل و حقیقت کی صورت اختیار کی، اور اس لیے حضرت ابراہیمؑ کو اس مسئلہ میں ایقان و تسلی کا وہ مقام حاصل ہو گیا جس کے حصول کے ابراہیمؑ خواہاں تھے۔

اس آیت میں چند نکات خصوصیت سے قابلِ غور ہیں:

۱۔ ایمان کلی مشکک ہے لہٰذا اس کے متعدد درجے اور مقامات و احوال ہیں۔ یہ اس نفسی کیفیت یا اذعان سے تعبیر ہے کہ جس سے اللہ تعالیٰ سے محبت و تودد کا جذبہ ابھرتا ہے، نیکی اور خیر سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے اور انفرادی اور اجتماعی سطح پر عمل و سلوک کی راہیں متعین اور روشن ہوتی ہیں۔ جو لوگ اس نعمت سے بہرہ مند ہوتے ہیں وہ قلب و ذہن کی دنیا میں ایک خاص نوع کی لذت اور اطمینان محسوس کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ لذت و اطمینان کی اس دولت میں برابر اضافہ ہوتا رہے۔ حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام جو تیقن و عقیدہ کی بلند ترین چوٹیوں پر فائز ہوتے ہیں، ان کی بھی یہی خواہش و آرزو ہوتی ہے کہ اس راہ میں مزید اطمینان حاصل ہو اور علم و ادراک کے ایسے مقامات و احوال سے دوچار ہوں جو دعوت و ارشاد کے تقاضوں کو اور استوار کر دیں۔ یہی وہ جذبہ تھا جسے حضرت ابراہیم خلیل اللہ ایسے جلیل القدر پیغمبر کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے رب سے وحی کے علاوہ ایسے شواہد کو دیکھنے کی درخواست کریں جن سے قوتِ ایمانی اپنی آخری سرحدوں کو پالینے میں کامیاب ہو جائے۔

۲۔ جب کسی بندے کے دل میں ایمان کی روشنی میں اور آگے بڑھنے کی آرزو مچلتی ہے تو رحمتِ حق جوش میں آ جاتی ہے اور حسبِ مرتبہ و درجہ تائیدات، کرامات اور خوارق کی بارش ہونے لگتی ہے، اور انسان اپنی اس حواس کی دنیا میں ایسے ایسے مشاہدات سے نوازا جاتا ہے کہ عام حالات میں جن کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ فیض و کرم اور جود و بخشش کا یہ اسلوب اس حقیقت کا غماز ہے کہ مقام بندگی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی نعمتوں سے قطع نظر خود اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے کتنا پیار ہے اور حق و صداقت یا ایمان و اسلام کی اشاعت کا کس درجہ پاس اور لحاظ ہے۔

حضرت ابراہیم کی اس تمنا و آرزو سے کہ انھیں احیاء موتیٰ کے عقیدے کو عالمِ محسوس میں تجربہ و مشاہدہ کی صورت میں دکھایا جائے۔ اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ پایا جاتا ہے کہ مابعد الطبیعی عقائد و تصورات اور حقیقت خارجی میں گہرا تعلق ہے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ ان میں سرے سے کوئی تضاد اور آن بن رونما نہیں۔ ربط و تعلق کی یہ کیفیت پائی جاتی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے موید اور معاون ہیں۔ یہی نہیں، دونوں ایک دوسرے کی تکمیل و اتمام کے خواہاں اور آرزومند ہیں۔ دونوں کی حیثیت ایک ہی حقیقت کے دو پہلوؤں اور ایک ہی منزل کے دو مسافروں کی ہے، بلکہ ادب و انشا کی زبان میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ دونوں ایک ہی شمع کے دو پروانے ہیں۔ یہی وجہ ہے، جمادات سے نباتات تک اور حیوانات سے لے کر انسان تک ارتقا کی جتنی کڑیاں ہیں ان سب میں ایک طرح کا ربط، تسلسل، اور غرض و مقصد کی یکسانی پائی جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایمانیات اور عقیدہ کی اپنی منطق اور اپنے پیمانے اور مقدمات بھی ہیں جن سے دائرۂ ایمان و عقیدہ میں داخل ہر تصور و فکر کی استواری و صحت کو جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے، تاہم ان کی تائید کا حسی سطح پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہتمام موجود ہے۔ چنانچہ اگر کوئی چاہے کہ وہ جن چیزوں کو مانتا اور تسلیم کرتا ہے ان کو تجربہ کی کسوٹی پر آزما کر دیکھ لے تو بشرطِ صحت اس کو حق ہے کہ سائنس یا تجربہ و مشاہدہ کی روشنی میں اس کی حقانیت کو معلوم کر سکے۔ اسلام میں وحی و تنزیل کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کے بیان کردہ حقائق و ایمانیات کی حسیات کے شواہد سے تائید نہیں ہو سکتی۔ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ازراہِ کرم، ان تصورات کو جو بجائے خود معقول اور سمجھ میں آنے والے ہیں اور جن کا گہرا تعلق اس عالمِ خارجی سے ہے، پہلے سے ایک ایسے اسلوب اور طریق سے واضح کر دیا ہے جو انبیا کے ساتھ خاص ہے۔

کہنا یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس مطالبہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان، اور سائنس یا عقیدہ و تجربہ میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور وہ وقت قطعی دور نہیں جب ایمان اور سائنس ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے زندگی کا سفر ایک ساتھ طے کریں گے۔

© rasailojaraid.com